© rasailojaraid.com

تعلیم وتعلّم

ڈاکٹر محمد امین☆

پاکستان کا دینی نظامِ تعلیم ...... چند اِصلاحی تجاویز

نظامِ تعلیم خواہ کوئی سا بھی ہو، اس کی تشکیل کے وقت اس کے اہداف ومقاصد کا تعین کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی نظامِ تعلیم کی کامیابی یا ناکامی کا تجزیہ کرنا ہو تو اس کا معیار یہی ہوسکتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ اپنے طے کردہ مقاصد واہداف کے حصول میں کتنا کامیاب یا ناکام رہا ہے؟ پاکستان میں اس وقت پرائیویٹ سیکٹر میں جو چھوٹے بڑے ہزاروں دینی مدارس کام کر رہے ہیں، ان کے قیام کے مقاصد کیا ہیں؟ ......ان مقاصد کو دو نکات میں شمار کیا جاسکتا ہے:(۱)

۱۔ ایسے علما کی تیاری جو دینی علوم میں مہارت رکھتے ہوں اور اعلیٰ شخصی کردار کے حامل ہوں۔

۲۔ یہ علما مسلمانانِ پاکستان کی دینی تعلیم کی ضرورت پوری کرسکیں اور ان کی دینی تربیت کرسکیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کیا ہمارے دینی مدارس ان اَہداف کے حصول میں کامیاب رہے ہیں؟ ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ نہایت کامیاب رہے ہیں اور پاکستانی معاشرے میں اس وقت جو بھی دینی سرگرمیاں نظر آتی ہیں، وہ انہی علما کی جدوجہد کا نتیجہ ہیں جو دینی وجاہت سے محرومی برداشت کر کے، رزقِ کفاف پر صبر کر کے معاشرے کو دینی تعلیم سے مالا مال کر رہے ہیں۔ انہی کے دم سے مسجدیں آباد ہیں جہاں پانچ وقت نمازیں پڑھائی جاتی ہیں، جمعہ کا خطبہ دیا جاتا ہے ، بچوں کو قرآن پڑھایا جاتا ہے۔دینی تہواروں اور پیدائش، نکاح، تدفین اور ایسے ہی دیگر مواقع پر دینی رسوم واَعمال بجا لائے جاتے ہیں۔ انہی دینی مدارس میں قرآن حفظ کروایا جاتا ہے، اس کی تجوید پڑھائی جاتی ہے ۔دورۂ حدیث کروایا جاتا ہے اور دوسرے دینی علوم پڑھائے جاتے ہیں وغیرہ ......یہ وہ اُمور ہیں جن سے کوئی شخص شاید ہی انکار کرسکے لیکن اس بارے میں ایک دوسرا نقطہ نظر بھی ہے جس کے مطابق :

۱۔ یہ مدارس دینی تعلیم مسلک کی بنیاد پر دیتے ہیں جس سے دینی افراد اور جماعتوں کے درمیان نہ صرف خلیج پیدا ہوچکی ہے بلکہ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اس نے نہ صرف مسلم عوام اور اُمت کو منقسم کر رکھا ہے بلکہ آپس میں بھی سرپھٹول سے آگے بڑھ کر نوبت قتل وغارت گری تک پہنچ چکی ہے۔ مدرسوں کے علاوہ مسجدوں پر بھی اہل مسلک کا قبضہ ہے اور مسجدیں اللہ کے گھر بننے کی بجائے مسلکوں کے گڑھ بن چکی ہیں۔

☆ سینئر ایڈیٹر 'دائرۃ المعارف الاسلامیۃ' : پنجاب یونیورسٹی، لاہور

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

۲۔اسی کا یہ بھی شاخسانہ ہے (اگرچہ دوسرے عوامل بھی ہیں) کہ علما اور دینی عناصر کے عدمِ اتحاد کی وجہ سے اس ملک میں آج تک شریعت نافذ نہیں ہوسکی۔حکومتیں علما اور ان کی جماعتوں کو آپس میں لڑائے رکھتی ہیں اور متحد نہیں ہونے دیتیں تاکہ وہ آرام سے حکومت کرتی رہیں۔ اگر علما اور ان کی جماعتیں صحیح معنوں میں متحد ہو جائیں تو نفاذِ اسلام کی چوٹی آسانی سے سر کی جاسکتی ہے۔

۳۔یہ بھی دینی مدارس کے نظامِ تعلیم وتربیت کا نقص ہے کہ وہ علماء میں اخلاص ، بے نفسی اور للّٰہیت پیدا نہیں کرتا اور انہیں اتنا بیدار مغز، شجاع اور زِیرک نہیں بناتا کہ وہ نفس کے حملوں سے بھی بچ سکیں اور اسلام دشمن عناصر کی سازشوں کو سمجھ کر اُن سے بھی نمٹ سکیں۔

۴۔دینی مدارس نے عصری علوم سے عدمِ اعتماد کی پالیسی کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔اس وجہ سے عصر حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کو جو چیلنج درپیش ہیں، وہ نہ اُنہیں سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کا مسکت جواب دے سکتے ہیں۔

۵۔پاکستان میں جو جدید تعلیم مروّج ہے، اس میں دینی تعلیم کا حصہ برائے نام ہے اور نہ وہاں اسلامی تربیت کا کوئی انتظام ہے۔دوسری طرف دینی مدارس میں جدید مضامین اور ماحول کا گزر نہیں۔اس چیز نے جدید پڑھے لکھے لوگوں اور علما میں ذہنی بُعد پیدا کر دیا ہے۔جس کا ثبوت یہ ہے کہ شہروں میں جمعہ کے دن کسی بھی مسجد میں جا کر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ تقریباً ۹۰ فیصد سے زیادہ لوگ صرف نماز کے وقت مسجد میں آتے ہیں اور مولوی صاحب کی تقریر سننے کے لیے چند گنے چنے لوگ ہی موجود ہوتے ہیں۔

۶۔علما کی اکثر جماعتوں نے اپنی ساری قوتیں سیاسی جدوجہد میں لگا دی ہیں۔ پہلے ہر مسلک کی ایک جماعت بنی، پھر جتنے لیڈر بنتے گئے ،ہر دینی سیاسی جماعت میں اتنے گروپ اور ذیلی جماعتیں بنتی گئیں جو آپس میں گتھم گتھا ہوتی گئیں اور علما کے کرنے کا جو اصل کام تھا یعنی تعلیم وتربیت ،دعوت واصلاح ،تبلیغ دین اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر ،ان کی طرف توجہ کم ہوگئی۔اس سے نہ صرف دین کی ترجیحات متاثر ہوئیں اور خود علما پر اس کا برا اَثر پڑا بلکہ اِس چیز نے علما کی ہوا خیزی کی ہے اور معاشرے پر ان کے اَخلاقی اثر کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے...... اِن کی سیاسی ناکامی کی بڑی وجہ بھی یہی ہے۔

۷۔عوام کی دینی تعلیم وتربیت کے حوالے سے بھی علماء کی ناکامیاں واضح ہیں مثلاً:

(الف) علما نے عوام کو دین اسلام کے بنیادی مآخذ قرآن وسنت سے براہِ راست استفادے سے محروم کر رکھا ہے۔زیادہ سے زیادہ مساجد میں ناظرہ قرآن پڑھایا جاتا ہے،لیکن قرآن کے ترجمے اور فہم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی ، نہ اَحادیث پڑھائی جاتی ہیں۔زیادہ زور اپنے مسلک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے فقہی مسائل کے بیان کرنے پر ہوتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ دینی مدارس میں علما کی اپنی تربیت بھی اسی نہج پر ہوتی ہے۔

(ب) جدید تعلیم جو پاکستان میں مروّج ہے، اُس میں دینی تعلیم و تربیت کا حصہ برائے نام ہے۔ علما نے اِس خلا کو پر کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش آج تک نہیں کی، حالانکہ یہ ایک انتہائی بنیادی بات ہے اور اس کے لیے مربوط اور منظّم کوششیں کی جانی چاہئیں تھیں۔

(ج) طبقہ اُناث اس سلسلے میں خاص طور پر مظلوم ہے کہ نہ اُن کے لیے مساجد میں نماز پڑھنے کا کوئی انتظام ہے، نہ خطبہ سننے کا اور نہ اُن کی دینی تعلیم کی کوئی صورت ہے؟

۸۔ اِن دینی مدارس کے انتظامی پہلوؤں پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ ہر مسلک کا اپنا وفاق ہے جو اپنے مسلک کے نقطہ نظر سے کتابیں پڑھاتا ہے۔ طلبہ کے داخلہ کے وقت عمر اور صلاحیت کی کوئی پابندی نہیں کی جاتی۔ اساتذہ کی اہلیت اور تنخواہوں کا کوئی معیار مقرر نہیں۔ اساتذہ کی فنی تربیت کا بھی کوئی اہتمام نہیں ، نیز اِن مدارس سے فارغ ہونے والوں کے لیے سوائے اپنے مسلک کی مساجد و مدارس میں تعیناتی کے، کوئی ذریعہ رزق نہیں اور جتنے طلبہ فارغ ہوتے ہیں، ظاہر ہے اتنی مساجد اور مدارس موجود نہیں کہ سب لوگ کھپ سکیں۔ لہٰذا مساجد پر قبضے کے جھگڑے بھی سامنے آتے ہیں اور اِسی طرح کے دوسرے مسائل بھی۔

ہماری رائے میں پہلا نقطہ نظر بھی صحیح تھا اور اس دوسرے نقطہ نظر میں بہت سی باتیں یقیناً قابل غور ہیں ...... مطلب یہ کہ دینی مدارس کی کچھ خدمات بھی ہیں جن سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ تاہم ان میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں جنہیں تسلیم کرنا چاہیے اور ان کی اِصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔ اگر علما اِصرار کریں کہ ان کے دینی نظام تعلیم میں کوئی خرابی نہیں۔ ان کے ہاں سب اچھا ہے اور کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں تو ہمارے خیال میں یہ بھی انصاف نہیں۔ اپنی کمزوریوں کو کھلے دِل و دماغ سے تسلیم کرنا اور ان کے اِزالے کی کوشش کرنا یہی زندہ اور شجاع اَفراد واَقوام کا چلن ہوتا ہے۔ اسی سے اداروں میں اصلاح و ترقی ہوتی ہے اور مستقبل میں اچھے نتائج نکلتے ہیں۔

لہٰذا آیئے، غور کرتے ہیں کہ پاکستان میں مروّج دینی نظامِ تعلیم میں کیسے اصلاح کی جائے کہ اِس کے طے کردہ اہداف اَحسن انداز میں حاصل ہوسکیں۔ لیکن تفصیلات میں جانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اُصولوں کا ذکر کردیا جائے جن پر ہماری اصلاحی تجاویز مبنی ہوں گی جو یہ ہیں:

© rasailojaraid.com

بنیادی اُصول

(۱) تعلیمی ثنویت کا تصور مضر ہے یعنی یہ تصور کہ دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کو دنیوی علوم کی کچھ خبر نہ ہو اور دُنیوی تعلیم حاصل کرنے والوں کو دینی تعلیم کا پتہ نہ ہو کیونکہ اس طرح مسلمان بچے کی شخصیت تقسیم ہو کر رہ جاتی ہے۔ جب کہ اسلام ایک وحدت ہے اور اس میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں۔

(۲) دینی تعلیم کا بنیادی ہدف دینی مضامین میں رُسوخ حاصل کرنا ہے لیکن اس کے لیے کسی خاص نصاب کو کوئی تقدس حاصل نہیں ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ نصاب کی ترجیحات کو بدلا جا سکتا ہے اور مختلف مضامین کی کمیت Weigtage کو بدلا اور طرقِ تدریس کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

(۳) عصر حاضر کے مسائل اور تحدیات کو سمجھنے کے لیے مغربی فکر اور جدید مضامین کا مطالعہ ضروری ہے۔

(۴) دینی تعلیم مسلک کی بنیاد پر نہیں دی جانی چاہئے۔ اسکے نقصانات کی طرف کچھ اشارات تمہید میں آ چکے ہیں کہ اس چیز نے علما میں انتشار، تعصب، فرقہ واریت اور دوسری بہت سی مصیبتوں کو جنم دیا ہے۔

(۵) تزکیہ و تربیت اور تحقیق بھی نصاب کا جز ہونی چاہیے۔

(۶) دینی تعلیم سے فارغ ہونے والے طلبہ کے لیے کسبِ رزق کا میدان وسیع ہونا چاہیے۔

...... اَب آیئے تفصیلی اور اِصلاحی تجاویز کی طرف اور ان میں بھی سب سے پہلے نصاب، کہ یہ نظامِ تعلیم کا بہت اہم عنصر ہے۔

ہماری رائے میں درسِ نظامی کے موجودہ نصاب میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں ناگزیر ہیں:

اولاً ...... دینی علوم

(۱) قرآنِ حکیم پر ترکیز: قرآنِ حکیم دینی تعلیم کا مرکزی مضمون ہونا چاہیے جو شروع سے لے کر آخر تک پڑھایا جائے۔ یہ نہ صرف دیگر دینی مضامین کا عمود ہو بلکہ اس کا لفظی ترجمہ نحوی و صرفی تحلیل کے ساتھ شروع سے آخر تک پڑھایا جائے۔ تفسیر کے مختلف مکتبہ ہائے فکر میں سے منتخب اجزا تعمق کے ساتھ پڑھائے جائیں۔ قرآنی آیات سے استنباطِ احکام کی مشق کروائی جائے۔ دیگر علومُ القرآن جیسے شانِ نزول، ناسخ و منسوخ، قرآءات اور اُصولِ تفسیر وغیرہ بھی پڑھائے جائیں۔

(۲) مطالعہ حدیث: دورۂ حدیث کے موجودہ طریقے کو ترک کر دیا جائے جس میں انتہائی کم مدت میں بہت سی کتبِ حدیث سے طالب علم کو گزار دیا جاتا ہے اور جو تھوڑی بہت تدریس ہوتی ہے وہ بھی محض فقہی مسلک کے نقطہ نظر سے۔ اس کی بجائے مطالعہ حدیث کو سارے تعلیمی عرصے پر پھیلایا جائے...... منتخب

© rasailojaraid.com

متون کا گہرا مطالعہ کرایا جائے۔ احادیث سے استنباطِ احکام کی مشق کروائی جائے اور علومُ الحدیث جیسے مصطلحات، اسماءُ الرجال، جرح وتعدیل، روایت ودرایت، تخریج، فتنہ انکارِ حدیث وغیرہ پر توجہ مرکوز کی جائے۔

(۳) فقہ کی تدریس کا موجودہ طریقہ ختم کر کے پہلے اُصول فقہ خصوصاً اُصولِ استنباط کا تقابلی مطالعہ کروایا جائے پھر منتخب موضوعات پر ائمہ اربعہ، ظاہریہ اور اہل تشیع کی آرا کا تقابلی مطالعہ کروایا جائے۔ فقہ القرآن والسنہ پر توجہ دی جائے اور پاکستان میں رائج قوانین کے ساتھ مقارنہ پیش نظر رکھا جائے۔

(۴) سیرت، کلام، مسلم تاریخ وجغرافیہ (بشمول مطالعہ پاکستان) اور تزکیۂ نفس کا قدرے تفصیلی مطالعہ اور فلسفہ ومنطق کا تعارفی مطالعہ بھی نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔

ثانیاً...... مغربی اور جدید علوم کا تعارفی مطالعہ

(۱) سماجی علوم میں سے معاشیات، سیاسیات، قانون، تاریخ، جغرافیہ، نفسیات اور فلسفہ وغیرہ

(۲) طبعی علوم میں سے فزکس، کیمسٹری، بیالوجی، ریاضی اور کمپیوٹر وغیرہ

(۳) اسلام اور مغربی تہذیب کے تقابل/تصادم سے پیدا ہونے والے مسائل کا تفصیلی مطالعہ بھی اِس نصاب کا ایک جز ہونا چاہیے۔ نیز اس مطالعے میں صرف مغربی فکر اور علوم کا تعارف ہی مقصود نہیں بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے ان کا جائزہ اور تنقید بھی اس میں شامل ہونی چاہیے تاکہ طلبہ پر مغربی فکر کی کمزوری اور اس کے مقابلے میں اسلامی فکر کی برتری اور حقانیت دلائل سے واضح ہو جائے۔

یہ تعارفی مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ علما جس دنیا میں رہ رہے ہیں، اُسے سمجھ سکیں۔ نیز اس وقت اسلام اور اسلامی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ علمی وفکری ہی نہیں، عملی مسئلہ، مغرب اور مغربی تہذیب کا علمی اور عملی تفوق ہے لہٰذا جب تک ہم چیلنج اور اس کی نوعیت کو نہیں سمجھیں گے اور اس کا اِدراک نہیں کریں گے، ہم اس چیلنج کا جواب کیسے دے سکیں گے اور اسلام کو موجودہ فضا میں قابل عمل کیسے ثابت کر سکیں گے اور اسے عملاً غالب کرنے کے لیے صحیح رُخ میں جدوجہد کیسے کر سکیں گے......؟

ثالثاً...... زبانیں

اس وقت کیفیت یہ ہے کہ اکثر دینی مدارس میں انگریزی کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے، بلکہ اُردو بھی نہیں پڑھائی جاتی۔ عربی زبان واَدب پر زور دیا جاتا ہے اور کسی حد تک فارسی بھی پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن ان دونوں زبانوں کی تدریس اس طرح ہوتی ہے کہ صرف انہیں پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے لکھنے اور بولنے کی نہیں۔ طریق تدریس بھی وہی پرانا ہے یعنی طریقۂ ترجمہ وگرامر جس میں گردانیں رٹائی اور قواعد یاد کروائے جاتے ہیں۔ ہماری رائے میں زبانوں کے بارے میں صحیح پالیسی یہ ہے کہ

© rasailojaraid.com

(الف) دینی مدارس کے طلبہ کو اُردو،عربی اور انگریزی تینوں زبانیں تعمق کے ساتھ پڑھائی جانی چاہئیں اور فارسی کا تعارفی مطالعہ بھی کروانا چاہیے۔ اردو اس لیے کہ یہ پاکستان کی قومی زبان اورعملاً ہمارے ہاں بول چال اورتقریر وتحریر کی زبان ہے ۔عربی اس لیے کہ ہماری اُمہات دینی کتب اسی زبان میں ہیں اورموجودہ عالم عرب سے ہمارے دین ودنیا کے بہت سے مفادات وابستہ ہیں۔ انگریزی اس لیے کہ یہ جدید علوم اور جدید دنیا کی کنجی ہے۔فارسی کا تعارفی مطالعہ برصغیر کی دینی اور ثقافتی تاریخ سے واقفیت کے لیے ضروری ہے۔

(ب) زمانۂ تدریس: اگر بچے کو ایک سے زیادہ زبانیں سکھانی ہوں تو ہماری رائے میں اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسے مادری زبان اچھی طرح سکھا دی جائے تا کہ وہ اس زبان کی مہارتوں کی اساس پر دوسری زبانیں سیکھ سکے۔ ہمارے ہاں یہ درجہ تقریباً اُردو کو حاصل ہے، اس لیے اردو سکھانے سے ابتدا کرنی چاہیے اور کم از کم اس سے دو سال بعد عربی کی ابتدا کرنی چاہیے (لیکن اُردو سکھانے کے لئے اگر ایسا استاد میسر نہ ہو جو اہل زبان ہو یا عربی پڑھے ہوئے ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ حروفِ تہجی اور ابتدائی قاعدہ پہلے عربی میں پڑھا دیا جائے اور پھر اُردو پڑھائی شروع کی جائے کیونکہ ہمارے ہاں تلفظ اور مخارج کے بگاڑ کا مسئلہ بڑا گھمبیر ہو چکا ہے۔ اور اس پر ابتدا ہی سے بھر پور توجہ دینے کی ضرورت ہے) انگریزی چار سال کے بعد شروع کی جائے اور پھر متوسطہ تک ان زبانوں کی تحصیل پر خوب محنت کی جائے کیونکہ مستقبل میں دیگر علوم میں مہارت کا انحصار بھی بچے کی اِن زبانوں میں مہارت ہی پر ہوگا۔ بعد میں کم کمیت کے ساتھ زبانوں کی تدریس اگلی جماعتوں میں جاری رہے گی۔ فارسی البتہ ثانوی میں ایک سال پڑھا کر چھوڑ دی جائے۔

(۳) ذریعہ تدریس: ابتدا میں ذریعہ تدریس اُردو ہی ہو گی، تاہم عربی وانگریزی کی تدریس میں طریق ترجمہ وگرامر کے ساتھ طریق مباشر (عملی مشق) کو بھی اہمیت دی جانی چاہیے اور اس کے نتیجے میں طلبہ جلد ہی عربی کے پیریڈ میں عربی اور انگریزی کے پیریڈ میں انگریزی پر انحصار کرنا شروع کر دیں گے۔ اس طرح اگر پہلے نو سال عربی اور انگریزی کی تحصیل پر خوب محنت کر لی جائے تو طلبہ آسانی سے ثانوی جماعتوں میں دینی علوم عربی زبان میں اور جدید علوم انگریزی زبان میں سیکھنے پر قادر ہو جائیں گے۔

(۴) زبانوں میں مہارت کے وسائل: ہمارے نزدیک مذکورہ تینوں زبانوں میں مہارت انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور تعلیمی اداروں کو اپنی ساری صلاحیتیں اس کے لیے وقف کر دینی چاہئیں ۔ کوشش کرنی چاہئے کہ زبانیں پڑھانے والے اساتذہ اَہل زبان ہوں۔ اس کے لیے مختبر اللغة (لنگویج

© rasailojaraid.com

لیب) قائم ہونی چاہیے، سمعی وبصری آلات اورکمپیوٹر کو استعمال کرنا چاہئے۔ تینوں زبانوں کی الگ الگ بزمِ ادب ہواورتحریری وتقریری مقابلے، مباحثے ومذاکرے اورہونہار طلبہ کے لیے انعامات ان کے مستقل پروگراموں کا حصہ ہوں تاکہ اِن مہارتوں کی تکمیل ہو سکے۔

رابعاً......نصابی وحدت

جدید وقدیم کی یکجائی کا مطلب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صبح کے اوقات میں درسِ نظامی پڑھا دیا جائے اورشام میں کسی ریٹائرڈ یا پارٹ ٹائم لیکچرر سے ایک دو جدید مضامین میں لیکچر دِلوا دیئے جائیں۔ یہ محض اَشک شوئی☆ ہے کیونکہ اس کا طالب علم کی شخصیت ،اس کے فکری ڈھانچے اوراس کے طرزِ زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑتا، نہ ہی وہ سنجیدگی سے جدیدعلوم سے استفادہ کر پاتا ہے۔ اس مسئلے کا صحیح حل یہ ہے کہ نصابی وحدت کو پیش نظر رکھا جائے یعنی نصاب ایک ہی ہو اوراس نصاب کے اندر موزوں مرحلے پر موزوں کیفیت اورکمیت کے حامل جدید مضامین بھی اسلامی تناظر میں شامل کئے جائیں۔ نصابی وحدت کے مؤثر اورخوشگوار اثرات ان شاءاللہ طالب علم کی شخصیت پر پڑیں گے۔

خامساً......مراحل مدتِ تعلیم

یہ ایک دقیق مسئلہ ہے۔ امریکہ، یورپ اورعرب ممالک میں ثانوی تعلیم ۱۲ سال کی ہوتی ہے۔ خود ہمارے ہاں بھی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ،اسلام آباد میں داخلے کا معیار ایف اے ہے اور پروفیشنل کالجز اور یونیورسٹیاں بھی (مثلاً میڈیکل اورانجینئرنگ وغیرہ) ایف ایس سی پاس طلبہ کو داخلہ دیتی ہیں اور پھر کم سے کم چار سال میں گریجویشن کرواتی ہیں اورمزید دو سال میں ایم اے یعنی کل ۱۸ سال میں ایم اے

☆ دینی مدارس میں الہامی علوم کے ساتھ عصری معلومات کا امتزاجی تصوراہم ہونے کے باوجود تدریسی اعتبار سے اسے ایک ہی وقت میں رکھنے کے تجربات عملاً بڑے ناکام ثابت ہوئے ہیں جس کی بڑی وجہ مقاصد کے علاوہ دومختلف طریق ہائے تدریس کا بُعد ہے کیونکہ ہمارے ہاں مروّج دنیاوی تعلیم میں طلبہ کا عمومی رجحان صرف امتحان پاس کرنے کا ہوتا ہے لہٰذا اُنہیں علم وفن یا نفسِ کتاب کے فہم سے تعلق برائے نام ہی رہتا ہے اور امتحان میں مطلوب پاس نمبر۳۳ فیصد بھی رہی سہی کسر نکال دیتے ہیں جب کہ دینی مدارس میں کتاب کے مضامین سمیت فہم کتاب کا بڑا اہتمام ہوتا ہے۔

اس وقت طریقہ ہائے تدریس میں فہم کتاب اورمضامین علم وفن کے تقابل سے قطع نظر صرف یہ توجہ دلانا مقصود ہے کہ کسی مثالی امتزاجی تصور کی طرف بڑھنے کے لیے عبوری مراحل کے اقدامات ناقص ہونے کے باوجود اہمیت رکھتے ہیں چنانچہ اگر فی الوقت دینی مدارس اقامتی ہونے کی بنا پر جزوی طور پر ہی دوسری شفٹ میں دنیاوی علوم کو شامل کر لیں تو ایک اہم پیش رفت ہوگی۔ بعدازاں امتزاجی مقاصد کی ہم آہنگی حاصل ہونے پر جب مثالی تدریسی طریق کار وجود میں آجائے تو پھر اسی طرح دینی اور دنیاوی علوم کو اکٹھا پڑھایا جاسکتا ہے جیسے درسِ نظامی کے ابتدائی دور میں دونوں علوم اس میں شامل ہونے کی وجہ سے اکٹھے پڑھائے جاتے تھے...... (محدث)

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

کروایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے پاکستانی طالب علم کو یورپ، امریکہ اور عرب دنیا وغیرہ میں ہر جگہ داخلہ لینے میں مشکل پیش آتی ہے ۔ دوسری طرف دبئی میں ایک تجربہ ہوا ہے جس میں سولہ سالہ گریجویشن کورس محض دس برسوں میں ختم کروایا جاتا ہے ۔ اس طریقے میں سال کے بارہ مہینے صبح شام پڑھائی ہوتی ہے۔ اور بچے کی عمر کے چھ قیمتی سال بچالیے جاتے ہیں۔

دینی مدارس میں اس وقت جو نظام رائج ہے، وہ یہ ہے کہ آٹھ سال تک تعلیم حاصل کئے ہوئے مڈل پاس طالبعلم کو داخلہ دیا جاتا ہے (گو بعض اوقات مدارس،خصوصاً چھوٹے مدارس میں بکثرت،اس اصول کی پابندی نہیں کی جاتی) اور دو سال میں ثانیہ عامہ،اگلے دو سال میں ثانویہ خاصہ،اس سے اگلے دو سال میں 'عالیہ' اور آخری دو سالوں میں 'عالمیہ' کی سند دی جاتی ہے ۔ یہ آٹھ سالہ تعلیمی دورانیہ پاکستانی سکولوں کالجوں میں مروّج میٹرک،ایف اے،بی اے اور ایم اے کے آٹھ سالہ تعلیمی دورانئے کے مساوی ہے لہٰذا ہمارے خیال میں اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں بلکہ دینی مدارس عموماً اقامتی ہوتے ہیں ، لہٰذا وہ سکولوں کالجوں کی نسبت زیادہ پڑھا سکنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔

نصاب کی بحث ختم کرنے اور نظامِ تعلیم کے دوسرے شعبوں کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے مناسب محسوس ہوتا ہے کہ کچھ ایسے اُمور کا ذکر کر دیا جائے جو کسی نہ کسی صورت میں نصاب سے بھی مُرتبط ہوتے ہیں ، یعنی تزکیہ وتربیت ، تحقیق اور روزگار وغیرہ

ا۔ تزکیہ وتربیت

تزکیہ وتربیت کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنے پیغمبر کے ذمے کام گنوائے تو تعلیم کتاب کے ساتھ تزکیے کا ذکر کیا (البقرۃ: ۱۲۹) بلکہ تزکیے کا ذکر تعلیم کتاب سے پہلے بھی کیا اور بعد میں بھی،جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اصل مقصود تزکیہ ہی ہے اور تعلیم بھی اس کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔[۲] چنانچہ حضور ﷺ کے طریق تعلیم سے پتہ چلتا ہے کہ آپؐ نے محض تعلیم ہی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ تزکیہ بھی کیا اور صحابہ کا طریقہ بھی یہی تھا کہ جتنا قرآن سیکھتے تھے، ساتھ اس پر عمل کی مشق بھی کرتے جاتے تھے۔ امام مالکؒ نے موطأ میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے سورۂ بقرہ آٹھ سال میں ختم کی (خطیب بغدادی کے بقول ۱۲ سال میں) اور اس خوشی میں اونٹ ذبح کرکے دعوتِ عام کی۔[۳]

ظاہر ہے کہ حضرت عبد اللہ کو ۸ سال محض ڈھائی پارے پڑھنے میں نہیں لگے بلکہ اس پر تدبر اور عمل میں اتنی مدت صرف ہوئی۔ بعد میں مسلم معاشرے میں جب تزکیہ وتربیت کے ایک خصوصی ادارے 'تصوف' نے راہ پالی تو یہ طریقہ وجود میں آیا کہ طالب علم پہلے تعلیم حاصل کرتا تھا اور اس کے بعد تزکیۂ

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

نفس کے لیے کسی دوسرے مربی کے پاس جا بیٹھتا تھا۔ اب اُمت میں عمومی انحطاط کے نتیجے میں تصوف کے نام پر نہ وہ صوفی رہے اور نہ وہ خانقاہیں اور بالعموم جو کچھ باقی بچا ہے وہ بعض رسوم کا ایک بے روح ڈھانچہ ہے یا محض شکم پروری کے طریقے۔ لہٰذا تزکیہ وتربیت کو محض اس اتفاق پر نہیں چھوڑا جا سکتا کہ اگر حسن اتفاق سے استاد ایسا ہو جو خود مزکی و مربی ہو تو بات بن گئی ورنہ سراسر محرومی مقدر ٹھہری بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ تزکیے وتربیت کو باقاعدہ ایک مضمون اور فن کی طرح نصابِ تعلیم کا ایک حصہ بنایا جائے اور دوسرے مواد کی طرح اس کا بھی باقاعدہ امتحان اور اس میں فیل ہونے والے کو سارے مضامین میں فیل تصور کیا جائے۔ ہم نے اس مضمون کی طرف توجہ کی اور ڈیڑھ سو صفحے کا ایک کتابچہ اس موضوع پر مرتب کر کے شائع کر دیا ہے کہ تعلیمی ادارے میں طلبہ کی دینی تربیت کیسے کی جائے۔[۴] محض یہ دکھانے کے لیے کہ ایسا نظام وضع کرنا ممکن ہے، ہم اس سے دو اقتباسات پیش کرتے ہیں:

”تعلیمی ادارے میں تربیتی نظام کا قیام[۵]

۱۔ مدرسے میں ہر استاد کو خود کو مربی سمجھنا چاہیے (خصوصاً صدر مدرّس اور مہتمم کو) اس کا مطلب یہ ہے کہ اتنا ہی کافی نہیں کہ وہ اپنے آپ کو طلبہ کے سامنے ایک ماڈل کے طور پر پیش کرے بلکہ اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ آگے بڑھ کر طلبہ کی تربیت کرے۔

۲۔ اگر کسی وجہ سے سربراہِ ادارہ خود اپنے آپ کو اس کام کے لیے موزوں نہ سمجھے تو اسے چاہیے کہ کسی موزوں استاد کو چیف مربی کے طور پر مقرر کر دے جو سارے سکول کے طلبہ کی تربیت کے لیے ایک مکمل اور مربوط لائحہ عمل مرتب کرے۔

۳۔ چیف مربی کو چاہیے کہ اساتذہ میں سے ہر کلاس کا ایک مربی مقرر کرے، بہتر ہو اگر ایسا استاد کلاس انچارج بھی ہو۔

۴۔ مربی استاد کو تدریس کے علاوہ کم از کم ہفتے میں ایک پیریڈ طلبہ کی تربیت کیلئے دیا جانا چاہیے۔

۵۔ کلاس کے مربی استاد کو چاہیے کہ کلاس کے طلبہ میں سے کسی موزوں طالب علم کو 'مربی' یعنی طلبہ کے اخلاق و کردار کا نگران مقرر کرے۔

۶۔ اگر تعلیمی ادارہ رہائشی ہو تو ہوسٹل کا ایک مربی ہونا چاہیے اور طلبہ میں سے ایک اس کا نائب ہو اور اگر ہوسٹل کے کئی بلاک ہوں تو ضروری ہے کہ ہوسٹل کے ہر بلاک میں ایک اُستاد مربی ہو جو طلبہ کے اخلاق وکردار کا ذمہ دار ہو۔ یہ استاد ہر ہوسٹل بلاک میں طلبہ میں سے کسی ایک موزوں طالب علم کو مربی یعنی طلبہ کے اخلاق وکردار کا ذمہ دار بنا دے۔

۷۔ چیف مربی اور مربی اساتذہ پر مشتمل ہر سکول میں ایک تربیتی کونسل ہونی چاہیے جو اپنے اجلاس باقاعدگی سے ہر ماہ منعقد کرے اور تربیت کے مسائل پر غور و فکر کرے۔

۸۔ ہر سکول میں طلبہ کی تربیت کی جانچ (Evaluation) اور تربیت کے نگران اساتذہ کی

© rasailojaraid.com

چیکنگ کا مؤثر انتظام ہونا چاہیے۔''

''تربیت کی جانچ (امتحان) کا نظام(۶)

جس طرح تعلیم میں طالب علم کی لیاقت جانچنے کے لیے امتحانوں کا ایک باقاعدہ نظام موجود ہے جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ کون سا طالب علم کتنا سیکھ رہا ہے اور ان امتحانوں ہی کی وجہ سے طلبہ اور اساتذہ کو خصوصی تیاری کا موقع ملتا ہے۔ اسی طرح تربیت کے کام کی جانچ کا بھی ایک نظام ہونا چاہیے...... ہم اس کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات تجویز کرتے ہیں:

(۱) تربیتی گراف کا طریقہ اپنایئے جس کی تفصیل یہ ہے:

. ہر مربی کلاس ٹیچر اپنی کلاس کا ایک تربیتی گراف بنائے جس میں طلبہ کے نام موجود ہوں۔

. اچھی کارکردگی کی صورت میں اضافی نمبر دیئے جائیں اور کمزوری دکھانے کی صورت میں نمبر منہا کر دیئے جائیں مثلاً اگر بنیادی نمبر ۱۰۰ ہوں تو جو طالب علم باقاعدگی سے نماز پڑھے، اسے ۲ نمبر دیئے جائیں اس طرح اس کے نمبر ۱۰۲ ہو جائیں گے اور جو طالب علم نماز نہ پڑھے تو اس کے ۲ نمبر منہا کر دیئے جائیں یعنی اس کے ۹۸ نمبر ہو جائیں۔ اس طرح مختلف کمزوریوں مثلاً جھوٹ بولنا، گالی دینا، جھگڑا کرنا، تاخیر سے سکول آنا اور وقت کی پابندی نہ کرنا وغیرہ ان میں سے ہر ایک کے دو نمبر ہوں اور ان کے ارتکاب پر اتنے نمبر کاٹ لئے جائیں اور اس کے برعکس اخلاقِ حسنہ کے بھی نمبر ہوں جو اس کے گراف میں جمع کر دیئے جائیں۔ اس طرح ہر طالب علم کو معلوم ہوتا رہے گا کہ اس کی اخلاقی حالت کیسی ہے؟

. ایسا تربیتی گراف نمایاں طور پر ہر کلاس میں آویزاں ہو تاکہ طلبہ اپنے نمبروں کی کمی بیشی سے آگاہ رہیں، جن کے نمبر کم ہو جائیں وہ اپنی اخلاقی کمزوری دور کر کے اپنے کم شدہ نمبر بڑھانے کی کوشش کریں اور جن کے نمبر زیادہ ہوں، وہ انہیں مزید بڑھانے کے لیے کوشاں ہوں۔ اس گراف میں جس طالب علم کے نمبر ایک مقررہ حد سے کم ہو جائیں، اسے تربیت کے پرچے میں فیل گردانا جائے اور اگلی کلاس میں نہ بھیجا جائے۔ جس لڑکے کے نمبر سب سے بڑھ جائیں، اُسے حوصلہ افزائی کا انعام دیا جائے یا سکول کا مثالی لڑکا قرار دیا جائے۔

. اس طرح کا گراف ہر طالب علم کی پرسنل فائل میں بھی موجود ہو اور کلاس روم میں درج ہونے والی معلومات وہاں بھی ریکارڈ کی جائیں۔ تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئے مثلاً بچے کے والدین کو دکھانے کے لیے یا فائل دیکھتے ہوئے بچے کی اخلاقی حالت کا اعادہ کرنے کے لیے۔

(۲) تربیتی گراف کو سامنے رکھتے ہوئے طلبہ کا سالانہ امتحان بھی لیا جائے اور اس کے باقاعدہ نمبر ہوں جو طالب علم کے فیل یا پاس ہونے پر اثر انداز ہوں۔ ایک طالب علم اگر تربیت میں فیل ہو تو اسے سارے مضامین میں فیل تصور کیا جائے اور اگلی کلاس میں ترقی نہ دی جائے۔

(۳) مربی اساتذہ کا احتساب اور چیکنگ بھی ہونی چاہیے تاکہ اگر ان کو مدد اور رہنمائی کی

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

ضرورت ہو تو وہ بر وقت مہیا کر دی جائے ۔اس غرض کے لیے چیف مربی یا مہتمم کو چاہیے کہ وہ تربیت کے انچارج اساتذہ سے ان کی کارکردگی بسلسلہ تربیت طلبہ کی ماہانہ رپورٹ طلب کرے اور مسائل ومشکلات میں اُن کو ضروری مشورے دے ۔اگر کافی تعداد میں طلبہ تربیت میں کمزور ہیں تو استاد کی پرسش ہونی چاہیے اور اسے تنبیہ کی جانی چاہیے بلکہ اس کی سالانہ کارکردگی کی رپورٹ میں بھی اس کا اِندراج ہونا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ دینی مدارس کے مُہتممین اور منتظمین کو اس امر کی فکر کرنی چاہیے کہ ان کی ذمہ داری محض دینی تعلیم دینا نہیں بلکہ اخلاق وآداب سمیت مکمل دینی شخصیت کی آبیاری کرنا ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو عنداللہ مسئول ہوں گے۔''

۲۔ تحقیق

آج کل کی جدید تعلیم میں ایم اے (عالمیہ) ہی سے تحقیق کا آغاز ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ساری تعلیم (ایم فل ، پی ایچ ڈی وغیرہ) تحقیق پر ہی مبنی ہوتی ہے ۔دینی مدارس میں تحقیق کو عموماً اہمیت نہیں دی جاتی ۔طالب ِعلم دورۂ حدیث کرکے فارغ ہو جاتا ہے مگر اسے تحقیقی اصولوں کا پتہ ہوتا ہے اور نہ اُسے تحقیق کی کوئی عملی مشق ہی کروائی جاتی ہے۔بعض بڑے دینی مدارس میں تخصص کا ذکر سننے میں آتا ہے لیکن وہ بھی عموماً روایتی انداز میں، لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ تحقیق کو باقاعدہ داخل نصاب کیا جائے۔ ہر اُستاد چھوٹے چھوٹے مقالے لکھوا کر طلبہ کو تحقیق کی مشق کروائے۔آخری سال کے شروع میں ہر طالب علم اپنے موضوعِ تحقیق کی تسجیل (رجسٹریشن) کروائے اور جب تک وہ تحقیقی مقالہ اُستاذ کی تسلی کے مطابق مکمل نہ کرے، اُسے سند جاری نہ کی جائے۔اس کے بعد تخصص کو رواج دیا جائے اور ایم فل اور پی ایچ ڈی کی طرح ریسرچ ڈگریوں کو رواج دیا جائے۔ظاہر ہے اس وقت جو نصاب مروّج ہے، اس میں رہتے ہوئے یہ گنجائش نہیں نکالی جا سکتی، البتہ ہماری تجاویز کے مطابق اگر نصاب کے سارے ڈھانچے پر اَز سر نو غور کیا جائے تو تحقیق کو جزوِ نصاب بنایا جا سکتا ہے۔

یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ تحقیق کو جز بنانا غیروں کی تقلید ہے بلکہ ہمارے اَسلاف نے تحقیق کا جو معیار قائم کیا ہے اور جس طرح عمریں تحقیق وتالیف میں صرف کی ہیں، وہ ہمارے لیے ایک قابل فخر نمونہ ہے ۔لہٰذا تحقیق کو جز وِنصاب بنانا ،طلبہ میں علمی وتحقیقی ذوق پروان چڑھانا اور اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کرنا اپنے اَسلاف کی علمی روایت کو زندہ کرنے کے مترادف ہے ۔ بلکہ اس میں کوتاہی کرنا دوں ہمتی ہے اور آج کے ترقی یافتہ دور میں 'نکو' بننے کے مترادف ہے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ تحقیق محض اپنے مسلک کو سچا ثابت کرنے کے لیے دلائل جمع کرنے کا نام

© rasailojaraid.com

نہیں ہے بلکہ تحقیق سے مراد تلاشِ حق ہونا چاہیے اور اس کے لیے پہلا زینہ معروضیت اور غیر جانبداری کا ہے کہ کھلے دل ودماغ کے ساتھ علم کا دامن تھاما جائے۔ اس کے لیے مناسب ہوگا کہ شروع میں ایسے تحقیقی مقالات لکھوائے جائیں جن میں مقارنہ (تقابلی مطالعہ) کا اہتمام ہو، تاکہ اختلافی معاملات میں دوسروں کے نقطہ نظر کو سمجھنے اور وزن دینے کا رجحان پیدا ہو۔

ایک اندازے کے مطابق دنیا میں اس وقت جتنی تحقیق ہورہی ہے، مسلم دنیا کا اس میں حصہ دس فیصد سے بھی کم ہے۔ مغرب صرف تحقیق کے بل پر تسخیر کائنات (سائنس اور ٹیکنالوجی) میں ہم سے آگے نکل گیا ہے۔ ہم بحیثیتِ اُمت جب تحقیق میں آگے تھے تو اس دنیا پر ہمارا سکہ چلتا تھا۔ آج ہم تحقیق میں پیچھے رہ گئے ہیں تو ہر لحاظ سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ خود اسلامی علوم میں تحقیق کے سلسلے میں مغرب میں جو کام ہوا ہے اور ہورہا ہے، ہمارے علما اگر انگریزی پڑھیں تو انہیں احساس ہو کہ ہمارے دامن میں شرمندگی کے سوا کچھ نہیں۔

۳۔روزگار

اس وقت ہمارے دینی مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ کے لیے صرف ایک ہی ذریعہ روزگار ہے اور وہ ہے اپنے مسلک کے مدارس ومساجد میں ملازمت۔ ظاہر ہے یہ مواقع محدود ہوتے ہیں۔ اس لیے سب لوگ اس میں نہیں کھپ سکتے ہیں۔ یہ چیز نہ صرف بے روزگاری کو جنم دے رہی ہے بلکہ اس سے بعض دیگر مفاسد بھی پیدا ہورہے ہیں۔ مثلاً دوسری مسالک کی مساجد پر قبضہ جو بعض اوقات نقض امن پر منتج ہوتا ہے یا بغیر ضرورت کے محض روزگار کے لیے نئی مساجد اور مدارس کا قیام (حقیقت یہ ہے کہ اس امر پر ایک تحقیقی سروے کی شدید ضرورت ہے کہ ہماری آبادی کو اس وقت کتنے مدارس ومساجد کی ضرورت ہے۔ ان مدارس سے کتنے طلبہ سالانہ فارغ التحصیل ہوتے ہیں اور ان کا ذریعہ روزگار کیا ہے؟ ......وغیرہ)

روزگار کے مواقع پیدا کرنا یا ان کی پلاننگ کرنا بنیادی طور پر ہماری حکومت کا کام ہے لیکن اگر حکومت کی مدد کے بغیر دینی مدارس کا اتنا بڑا نیٹ ورک چل رہا ہے تو انہیں اپنے طلبہ کے روزگار کے مسئلے پر حکومتی مدد کے علیٰ الرغم بھی غور کرنا چاہیے۔

اس سلسلے میں ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے منتظمین اپنے طلبہ کو جدید تعلیم اور پیشہ وارانہ تعلیم نہ دینے کے حق میں اس لیے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح یہ طلبہ مجبور ہوکر مساجد ومدارس کو آباد رکھیں گے ورنہ وہ کہیں اور ملازمت کرلیں گے جہاں انہیں زیادہ تنخواہ ملے گی اور مساجد ومدارس ویران ہوجائیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ خدشہ بے جا ہے کیونکہ اس وقت جتنے طلبہ ان مدارس سے فارغ ہورہے ہیں،

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

ان کے لیے ملازمتیں موجود نہیں ہیں۔ ہماری رائے میں دینی مدارس کے طلبہ کے روزگار کی پلاننگ کے لیے مندرجہ ذیل نکات پر غور ہونا چاہیے:

۱۔حکومتِ پاکستان ان مدارس کی ڈگریوں کو درجہ بدرجہ تسلیم کر کے یعنی ثانویہ عامہ میٹرک کے برابر، ثانویہ خاصہ ایف اے کے، عالیہ بی اے کے اور عالمیہ ایم اے کے برابر قرار دی جائے۔ تاکہ ان طلبہ کے لیے جدید تعلیم اور پرائیویٹ و پبلک سیکٹر میں روزگار کے دروازے کھل سکیں۔ اسی طرح عالمیہکے بعد ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کی بھی اجازت ہونی چاہیے۔ جنرل ضیاءُالحق کے زمانے میں اس سلسلے میں کچھ پیش رفت ہوئی تھی لیکن بعد میں معاملہ سست پڑ گیا۔ اب حال ہی میں جاری ہونے والی تعلیمی پالیسی میں میٹرک اور ایف اے میں درسِ نظامی گروپ متعارف کروایا گیا ہے اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد نے بھی درسِ نظامی کے مضامین میں ڈگریاں دینے کا آغاز کر دیا ہے لہٰذا امید کی جانی چاہیے کہ مستقبل قریب میں دینی مدارس کے نظامِ تعلیم اور حکومتی نظام تعلیم کے درمیان حائل فرق بتدریج کم ہوتا جائے گا۔

۲۔ ہماری تجویز کے مطابق اگر دینی مدارس عربی کے ساتھ اپنے طلبہ میں انگریزی اور اردو میں بھی مہارت پیدا کر دیں اور انہیں جدید علوم کا تعارفی مطالعہ بھی کروا دیں تو ہمارے خیال میں وہ معاشرے میں بہت سے میدانوں میں اپنی راہ خود بنالیں گے۔

۳۔ جس نصاب کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، وہ سولہ سال میں اسلامی علوم میں ایم اے (عالمیہ) کا ہے لیکن اس میں بی اے (عالیہ) تک اُردو، عربی اور انگریزی زبانیں بھی پڑھائی جائیں گی گویا پاکستانی یونیورسٹیوں میں اس وقت مروّج قاعدے کے مطابق بھی وہ ان تین مضامین میں ایم اے کرنے کے حق دار ہیں، ہماری تجویز یہ ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ کو ان تین زبانوں میں بی اے (عالیہ) کرنے کے بعد تین سالوں میں اس طرح ایم اے کروا دیا جائے کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک زبان ان کا اصلی تخصص (Major) ہو اور علومِ اسلامی ضمنی تخصص (Minor) ۔ اس طرح وہ سولہ کی بجائے سترہ سالوں میں ان زبانوں میں سے کسی ایک میں ایم اے بھی کر لیں گے اور ساتھ ہی ثقہ دینی عالم بھی ہوں گے اور اُن کے لیے روزگار کے زیادہ مواقع بھی پیدا ہو جائیں گے۔

۴۔بعض پیشہ ورانہ اُمور میں تربیت دینی تعلیم کے ساتھ بھی اس طرح دی جاسکتی ہے کہ طلبہ فارغ التحصیل ہونے تک اس شعبے میں مہارت بھی حاصل کر لیں خصوصاً اس سہولت کی وجہ سے کہ طلبہ کی رہائش بھی انہی مدارس میں ہوتی ہے، مثلاً مختلف کمپیوٹر کورسز (Computer Languages, Maintenance, اور کمپوزنگ وغیرہ) بجلی کا کام، فریج، ٹی وی وغیرہ کی مرمت، گاڑیوں کی مرمت، ٹائپ، شارٹ ہینڈ،

© rasailojaraid.com

دفتری اُمور، ابتدائی حسابات، تدریسی مہارت (سی ٹی، بی ایڈ کی طرز پر) چھوٹے موٹے بزنس وغیرہ۔

بڑے شہروں میں دینی مدارس انڈسٹری کے ساتھ رابطہ کر کے گرمیوں کی چھٹیوں میں یا شام کی شفٹ میں طلبہ کو اضافی کام دلوا سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ پہلے خود دینی مدارس یہ فیصلہ کریں کہ وہ اپنے طلبہ کے لیے مسلک کے مدارس ومساجد کے باہر رِزق کے دروازے کھولنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارے خیال میں اس طرح کے مواقع پیدا ہونے سے دینی کاز کو ان شاء اللہ نقصان نہیں پہنچے گا۔ جیسا کہ ماضی میں دیوبند میں طب، جلد سازی اور خطاطی وغیرہ کے شعبے قائم کرنے سے کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔

تغیرنصاب اور علماء کی مخالفت

نصاب اور اس کے متعلقات کے حوالے سے ایک بنیادی بات پر غور کر لیں اور یہ کہ ہمارے علما کرام آخر کیوں درسِ نظامی پر نظر ثانی کرنے اور عصری ضرورتوں کے مطابق اس میں تبدیلیاں لانے کے لیے تیار نہیں ہوتے ......؟

اس کی وجہ بعض لوگ تو یہ بتاتے ہیں کہ اس سے علما کی اجارہ داری خطرے میں پڑ جائے گی، یہ ان کے رزق کا مسئلہ ہے، مدرسے دینی اور دینی+ سیاسی جماعتوں کے لیے قوت کا مرکز ہیں، وہ اِن پر سے اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں وغیرہ ، وغیرہ۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کا بڑا سبب اقبال کے لفظوں میں یہ ہے کہ ؎

آئین نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

علما اگر وسعت اور بلند نگاہی سے کام لیں تو یہ کوئی ایسا بھاری پتھر بھی نہیں جسے اُٹھایا نہ جا سکے۔ اور کوئی ایسی ضرورت نہیں کہ علماء کے خلوص پر لازماً شک وشبہ کا اظہار ہی کیا جائے۔ ہم صرف ان کی تذکیر (یاددہانی) کے لیے عرض کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں ماضی میں کبھی نصابِ تعلیم جامد نہیں رہا بلکہ یہ ہمیشہ بدلتا رہا ہے اور عصری ضرورتوں کے مطابق بہت سے معاوِن علوم بھی دینی نصاب تعلیم کا حصہ رہے ہیں۔ نیز طریقہ تدریس تعلیم بھی بدلتا رہا ہے۔ یہ مقدمات جو ہم نے قائم کئے ہیں، ہم چاہیں گے کہ ان پر کچھ مزید روشنی ڈالیں:

نصابِ تعلیم میں تنوع اور تغیر پذیری...... چند تاریخی نظائر

عہدِ رسالت وصحابہ میں دینی نصابِ تعلیم کا ایک ہی باقاعدہ مضمون تھا اور وہ تھا قرآن حکیم یا حضرت عمرؓ فاروق کی والدین کو یہ ہدایت سامنے آتی ہے کہ

© rasailojaraid.com

''اپنے بچوں کو تیراکی، شہسواری، مشہور ضرب الامثال اور اچھے اشعار سکھاؤ۔''(۷)

حضرت عمر بن عبد العزیز (م ۵۸ھ) نے حدیث اور مغازی کے درس کا حکم دیا۔(۸) دوسری صدی میں موطاً کی تالیف سے تدوین حدیث کا کام شروع ہوا تو درسِ حدیث نے محکم صورت اختیار کر لی۔ اسی طرح جب فقہ کی تدوین شروع ہوئی تو مساجد و مدارس میں اس کی تحصیل بھی شروع ہوگئی۔ چوتھی صدی ہجری میں تصوف بطور ایک ادارہ کے اُبھرا اور اس پر کتابیں لکھی جانے لگیں تو وہ کتب بھی نصاب کا حصہ بن گئیں۔ قرآن وحدیث، ان سے متفرع علوم اور فقہ تو خالص دینی علوم اور عربی زبان واَدب اور تاریخ وجغرافیہ، مسلمانوں کی اپنی داخلی فکری حرکت کا نتیجہ تھے لیکن جلد ہی مسلمانوں نے یونانی اثرات کے تحت سماجی علوم میں منطق، فلسفہ، علم النفس، علم الکلام اور زبانوں میں یونانی، عبرانی، ترکی، فارسی، وغیرہ پڑھنی پڑھانی شروع کردیں۔ اسی طرح سائنسی علوم میں طب (میڈیکل)، ہندسہ (انجینئرنگ)، ریاضی، ہیئت وفلکیات (اسٹرانومی)، اور کیمیا (کیمسٹری) وغیرہ مسلمان معاشرے میں علم پڑھنے پڑھائے جانے لگے۔ یہ علوم دینی مدارس اور مساجد میں پڑھائے جاتے تھے اور دینی ودنیوی علوم یا خالص دینی اور عصری علوم میں کوئی فرق وامتیاز نہ برتا جاتا تھا۔(۹)

دور کیوں جایئے ...... خود مسلم ہندوستان کی نصابی تاریخ پر ایک نظر ڈال لیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ خالص دینی علوم کے ساتھ وہاں معاون علوم کے طور پر دیگر سماجی وسائنسی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے اوران کی ترجیحات میں بھی ردّوبدل ہوتا رہتا تھا مثلاً چودھویں سے سولہویں عیسوی کے وسط تک دینی مدارس میں تفسیر، حدیث، فقہ، اُصول، کلام، تصوف کے ساتھ ساتھ صرف، نحو، معانی اور منطق بھی پڑھائی جاتی تھی۔ اس زمانے میں زور فقہ، اصولِ فقہ پر تھا اور تدریس حدیث کی اہمیت قدرے کم تھی۔(۱۰)

سولہویں صدی کے وسط میں اور سکندر لودھی کے زمانے میں مولانا عبد اللہ اور عزیز اللہ نے فقہ اور اُصول کی کمیت کم کر کے منطق وفلسفے کی کتب میں اضافہ کر دیا۔ اسی طرح علامہ تفتازانی کے شاگردوں نے علم بلاغت اور کلام میں نئی کتب مروّج کرائیں، لیکن شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اور ان کی اولاد کوشش کے باوجود فن حدیث کو رائج نہ کراسکی۔

اس کے بعد دورِ اکبری میں شاہ فتح اللہ شیرازی ہندوستان آئے تو انہوں نے نصاب میں مزید تبدیلیاں کیں۔ ان کے مرتب کردہ نصاب کی جو تفصیل شاہ ولی اللہؒ نے دی ہے، اس میں تفسیر، حدیث، فقہ واُصولِ فقہ، تصوف اور کلام کے علاوہ نحو، منطق، بلاغت، فلسفہ، ہیئت، حساب اور طب بھی شامل ہیں۔

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

ظاہر ہے اس فہرست میں دینی علوم کے علاوہ تقریباً اتنے ہی مضامین معاون اور عصری علوم کے ہیں جن میں سماجی اور سائنسی علوم دونوں شامل ہیں۔ اسی زمانے میں فارسی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا اور سنسکرت کی تدریس بھی شروع ہوگئی اور بقول شبلی، موسیقی بھی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی تھی۔[۱۱] شاہ ولی اللہ (م ۱۷۶۲ء) نے علم حدیث کو مروّج کرنے کی کوشش کی اور معقولات پر مزید زور دیا۔[۱۲]

ملا نظام الدین (۱۷۴۷ء) نے جو نصاب بنایا، جو آج درسِ نظامی کے نام سے مشہور ہے، اس میں تفسیر، حدیث، فقہ واُصولِ فقہ، کلام کے علاوہ صرف ونحو، بلاغت، منطق، فلسفہ اور ریاضی شامل تھے۔ اس نصاب میں قرآن وحدیث کا حصہ بہت تھوڑا تھا۔ سیرت، تصوف، معاشرتی علوم وغیرہ موجود نہ تھے اور معقولات پر زور تھا۔ تاہم اس میں بھی تبدیلیوں کا عمل جاری رہا۔ ملا نظام الدین کی وفات کے بعد اِس میں مناظرہ، اُصولِ حدیث، ادب اور فرائض کے مضامین کا اضافہ کیا گیا۔

جب ۱۸۷۶ء میں دیوبند قائم ہوا تو وہاں بھی درسِ نظامی ہی رائج ہوا لیکن مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید گنگوہی نے دیوبند میں رائج درسِ نظامی کو مختصر کرنے کا فیصلہ کیا اور فارسی کے علاوہ منطق وفلسفہ کی پرانی کتابیں نصاب سے خارج کردیں۔ اور مدت تدریس دس کی بجائے چھ سال کردی، تاکہ طلبہ درسگاہ سے جلد فارغ ہوکر جدید تعلیم بھی حاصل کریں، مولانا کے الفاظ یہ تھے

> ''اس کے بعد (مدرسہ میں دینی تعلیم کے بعد) اگر طلبہ مدرسہ ہذا، مدارسِ سرکاری میں جا کر علومِ جدیدہ حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤثر ہوگی۔''

اور مولانا گنگوہی نے اس موقع پر کہا تھا:

> ''اس منطق وفلسفہ سے تو انگریزی بہتر ہے کہ اس سے دنیا کی بہتری کی تو امید ہے۔''

لیکن روایتی علما کے احتجاج پر انہیں پرانا نظام بحال کرنا پڑا۔[۱۳] شبلی،[۱۴] اور مولانا ابوالکلام آزاد[۱۵] کے علاوہ خود حلقہ دیوبند کے اپنے لوگوں میں سے مولانا مناظر احسن گیلانی،[۱۶] مولانا سعید احمد اکبر آبادی،[۱۷] قاضی زین العابدین سجاد[۱۸] اور دوسرے بہت سے علما درسِ نظامی کے موجودہ نصاب پر علی الاعلان تنقید کرتے رہے ہیں۔ بلکہ مولانا عبیداللہ سندھی (م ۱۹۴۵ء) نے تو دہلی میں باقاعدہ ایک ادارہ نظارۃ المعارف کی بنیاد رکھی تاکہ دیوبند اور علی گڑھ کے تعلیمی اداروں کو یکجا کیا جاسکے۔[۱۹]

خود دار العلوم نے ۱۹۲۸ء میں اعلان کیا تھا کہ فلسفہ کی جدید کتابوں کو داخل درس کیا جائے گا لیکن اس پر عمل نہ ہوسکا۔[۲۰] مولانا حسین احمد مدنی کے آخری زمانے میں پھر نصاب پر نظر ثانی کی تحریک شروع ہوئی اور دارُالعلوم کی مجلس شوریٰ نے باضابطہ ایک کمیٹی کی تشکیل اس مقصد کے لیے کی جس نے نصاب میں

© rasailojaraid.com

کئی ترمیمات تجویز کیں اور قدیم علومِ عقلیہ کو کم کر کے انگریزی اور علومِ جدیدہ کو اس میں شامل کرنے کی سفارش کی مگر بعض وجوہ سے اس کمیٹی کی سفارشات پر عمل نہ ہوسکا[۲۱] تاہم اس کی ضرورت برابر محسوس کی جاتی رہی[۲۲] ...... پاکستان بننے کے بعد درسِ نظامی میں معمولی تبدیلیاں ہوئی ہیں چنانچہ دینی تعلیم کے موجودہ وفاقوں کے نصاب پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ معقولات پر زور کم ہوا ہے اور قرآنِ حکیم کے مکمل ترجمے کو شامل نصاب کرلیا گیا ہے۔[۲۳]

وقت اور حالات کے بدلنے کے ساتھ نصاب کے بارے میں ہمارے اہل علم وفکر کی رائے کس طرح بدلتی ہے، ہم اس کی ایک دو مثالیں مزید دے کر اب بحث کو ختم کرتے ہیں:

علم ھندسہ کے بارے میں ابن خلدون نے کہا ہے کہ اس سے انسانی صلاحیتوں کو جلا اور اس کے جذبہ صدق وصفا کو استحکام ملتا ہے۔[۲۴] اس کے برعکس اس علم کے بارے میں حضرت مجدد الفِ ثانی کی رائے یہ ہے کہ علم ہندسہ بیکار اور مہمل علم ہے۔[۲۵] ......فقہ صدیوں سے مسلم معاشرے میں اسلامی علوم کا ایک ستون ہے لیکن امام غزالی نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ یہ علم مصالح دنیا ہے۔[۲۶] ...... تصوّف کی کتابیں بھی صدیوں ہمارے مدارس میں پڑھائی جاتی رہی ہیں لیکن ہندوستان کے عظیم درویش صفت حکمران عالمگیر نے مجدد صاحب کے خطوط پڑھنے پر پابندی لگا دی[۲۷] اور صوفی محبّ اللہ کی کتاب تسویہ کو جلانے کا حکم دیا تھا یہاں تک کہ دیوبند میں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے صوفیوں کی موجودگی کے باوجود کتبِ تصوف کو دیوبند کی درسیات میں جگہ نہ مل سکی۔

طریقہ تعلیم وتدریس میں تغیر وتبدل

صدرِ اوّل میں تعلیم مسجد میں اور زبانی ہوتی تھی۔ استاد درس دیتا تھا اور یاد کرنے والی نصوص خصوصاً احادیث کو تین دفعہ دہراتا تھا تاکہ طلبہ کو یاد ہو جائیں۔ اس غرض کے لیے ایک مُعید (دہرانے والا) بھی ہوتا تھا جو اُستاد کی مدد کرتا تھا۔ لکھنے کی سہولت جب عام ہوئی تو یہ طریق تلقین، طریق املا میں بدل گیا۔ اب طلبہ استاد کے لیکچر کے نوٹس لے لیتے تھے اور یہ نوٹس بعض اوقات کتابی صورت میں جمع کردیئے جاتے تھے۔ (ابوعلی کالی اور سید مرتضی کے اَمَالِی، دراصل ان کے دروس اور لیکچر ہی ہیں) عرصے تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر جب طالب علموں کے لیے کتابوں کا حصول عام ہوگیا تو تدریس کتابی صورت اختیار کرگئی۔ اب استاد لیکچر کی بجائے کتاب پر اعتماد کرتا۔ طالب علم کتاب پڑھتا جاتا اور اُستاد مشکل مقامات کی شرح کرتا جاتا یا طلبہ کے سوالات کا جواب دے کر مسائل واضح کر دیتا۔ پھر ایک زمانے میں جب ان

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

کتابوں پر حاشئے اور شرحیں لکھی جانے لگیں تو استاد بھی یہ شرحیں اور حواشی پڑھنے لگے اور اصل کتابیں پس منظر میں رہ گئیں۔

ابتدائی تعلیم مساجد یا ابتدائی مکاتب میں جنہیں کُتَّاب کہا جاتا تھا، دی جاتی تھی۔ یہاں قرآن حکیم اور لکھنے پڑھنے کی ابتدائی مہارتیں سکھائی جاتی تھیں۔ اساتذہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہوتے تھے اور طلبہ کو مار بھی پڑتی تھی۔ ابن خلدون نے اپنے مشہورِ زمانہ مقدمہ کی ایک فصل میں قرآن کے طرقِ تدریس پر بحث کی ہے کہ عالم اسلام میں عموماً بچے کو قرآن چھوٹی عمر میں پڑھا اور رَٹا دیا جاتا ہے جب کہ اسے کچھ سمجھ نہیں ہوتی لیکن مغربِ عربی خصوصاً اَندلس میں یہ طریقہ رائج ہے کہ بچے کو پہلے زبان پڑھائی جاتی ہے اور جب وہ زبان کی باریکیوں کو سمجھنے لگتا تو پھر اسے قرآن پڑھایا جاتا ہے تاکہ وہ اسے اچھی طرح سمجھ کر پڑھے۔ ابن خلدون نے قاضی ابن ُالعربی کی کتاب الرحلة کے حوالے سے قاضی صاحب کے مؤخر الذکر طریقے کو راجح سمجھنے کے رجحان کو خود بھی پسند کیا ہے بشرطیکہ اس اَمر کا یقین ہو کہ بچہ تعلیم جاری رکھے گا۔ ورنہ والدین اس ڈر سے کہ بڑا ہو کر بچہ نہ معلوم، تعلیم جاری رکھے تو کم از کم قرآن تو پڑھا ہوا ہو کیونکہ والدین اپنے بچوں کو قرآن کی تعلیم دینا اپنی اخلاقی و دینی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔[۲۸]

مختصر یہ ہے کہ ہمارے کہنے کا مدعا یہ ہے کہ طرقِ تدریس کوئی جامد اور مقدس چیز نہیں۔ یہ زمانے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور اسے آج بھی بدلا جا سکتا ہے۔ دنیا میں ثانوی زبان سیکھنے پر پچھلی ایک دو صدیوں میں بہت سے تجربات ہوئے ہیں، لہٰذا ان سے استفادہ کرنے میں کوئی عیب نہیں مثلاً عربی سیکھنے میں طریق مباشر (Direct Method) سے کام لینا یا جدید آلات مثلاً مختبر اللغة اور دیگر سمعی و بصری آلات اور کمپیوٹر وغیرہ کا استعمال کرنا یا امتحان میں سمسٹر سسٹم (عرصۂ تدریس کو مختصر مراحل میں تقسیم کر کے تین چار ماہ بعد امتحان لے لینا) اور معروضی سوالات کو رواج دینا تاکہ طلبہ کی سال بھر کی محنت کے نتائج کا انحصار صرف تین گھنٹے کے پرچے پر نہ ہو جو درحقیقت صرف حافظے کا امتحان ہوتا ہے اور جس میں دوسری صلاحیتیں دَب کر رہ جاتی ہیں۔

اساتذہ

اساتذہ کسی بھی تعلیمی ادارے کی جان ہوتے ہیں۔ نصاب اگر ناقص بھی ہو تو ایک اچھا استاد اس کی کمی پوری کرسکتا ہے لیکن اگر استاد نالائق ہو تو اچھا نصاب بھی اس کے لیے بیکارِ محض ہے۔ استاد کی یہ اہمیت اس وجہ سے ہے کہ طلبہ، شعوری اور غیر شعوری طور پر، استاد کو ماڈل سمجھتے ہیں اور اپنی زندگی میں استاد کی شخصیت اس کے کردار، عادات اور رویوں کی نقل کرتے ہیں۔ لہٰذا جس طرح کا استاد ہو گا اسی طرح

© rasailojaraid.com

کے شاگرد ہوں گے۔ استاد کی اس اہمیت کے پیش نظر ضروری ہے کہ استاد کو اہمیت دی جائے جس کے لیے مندرجہ ذیل امور ناگزیر ہیں:

(۱) دینی مدارس کے اساتذہ کی ٹریننگ کا انتظام ہونا چاہیے یعنی جو فارغ التحصیل طالب علم استاد بننا چاہے، اس کے لیے لازمی ہو کہ وہ پہلے تربیتِ اساتذہ کا کورس مکمل کرے جس کا دورانیہ کم سے کم ایک سال ہو جس میں نہ صرف تعلیم وتربیت کے اُصول اور منہاج طلبہ کو سکھائے جائیں بلکہ تدریس کی عملی مشق بھی کروائی جائے۔ اسی طرح اس ٹریننگ میں نہ صرف تدریس کے فنی پہلوؤں پر توجہ دی جائے بلکہ زیر تربیت اساتذہ کی نظریاتی تربیت بھی کی جائے تاکہ نہ صرف ان کے اپنے اندر ایک مثالی مسلمان بننے کا داعیہ پیدا ہو بلکہ اپنے طلبہ کو مثالی مسلمان بنانے کا جذبہ بھی ان کے اندر خوب انگیخت ہو اور اس کے منہاج اور حکمتِ عملی سے بھی وہ بخوبی واقف ہوں۔

(۲) جو اساتذہ اس وقت دینی مدارس میں پڑھا رہے ہیں اور انہوں نے کسی طرح کی تربیت حاصل نہیں کی، ان کے لیے کام کے دوران تربیت اور چھٹیوں میں ریفریشر کورسز کا اہتمام کیا جائے۔

(۳) اساتذہ کے کیڈر (کورس) بنائے جائیں یعنی یہ طے کر دیا جائے کہ کس اہلیت کا استاد کس درجے کے طلبا کو پڑھا سکتا ہے۔ بڑے درجوں کو پڑھانے والے اساتذہ کے لیے تجربے، تحقیق اور تصنیف وتالیف کی خصوصی شرائط ہونی چاہئیں۔ متعلقہ اہلیت کے بغیر استاد کی تعیناتی کالعدم تصور ہونی چاہیے۔ اسی طرح اساتذہ کی کم از کم تنخواہوں کے سکیل بھی مقرر ہونے چاہیے۔ اگرچہ یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ دینی مدارس پر بہت زیادہ مالی بوجھ ہے لیکن اس کے باوجود ان مدارس کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے ناگزیر ہے کہ اساتذہ کے حالاتِ کار بہتر بنائے جائیں۔ انکے معاوضے بڑھائے جائیں اور انہیں باعزت زندگی گزارنے کے مواقع مہیا کئے جائیں تاکہ وہ دلجمعی سے عمل تدریس میں فعال کردار ادا کرسکیں۔

(۴) تدریسی تربیت کے لیے صرف ان طلبہ کو منتخب کیا جائے جو تدریس کا رجحان رکھتے ہوں اور اسے بطورِ مشن اپنانا چاہتے ہوں۔ یہ نہ ہو کہ جسے اور کوئی ملازمت نہ ملے وہ مدرّس بن جائے۔ نیز اس امر کی ضمانت کے لیے کہ صرف لائق طلبہ ہی اس طرف آئیں، انتخاب کے وقت کڑا معیار مقرر ہونا چاہیے مثلاً کم از کم درجہ جیّد جدّا...... نیز انٹرویو کے علاوہ اس غرض کے لیے خصوصی امتحان بھی لیا جاسکتا ہے۔

(۵) دوسرے بڑے اداروں کی طرح دینی مدارس میں بھی اساتذہ کے لیے اجتماعی سہولتیں ہونی چاہئیں جیسے ایک شہر سے دوسرے شہر میں تبادلے کی سہولت میں اَولڈ ایج بینیفٹ (کبر سنی فنڈ) اور بنوولینٹ فنڈ (اجتماعی بہبود فنڈ) وغیرہ۔ دینی مدارس کے وفاقوں کو اس سلسلے میں حکومتِ پاکستان سے

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

اصرار کر کے بعض سہولتیں لینی چاہئیں تاکہ دینی مدارس میں تدریس اگر پرکشش نہیں تو کم از کم قابل قبول پیشہ تو بن سکے۔

طلبہ

اس وقت عمومی کیفیت یہ ہے کہ والدین غربت کی وجہ سے اگر بچوں کی تعلیم و پرورش نہ کرسکیں یا بچہ خدانخواستہ معذور ہو جائے یا جدید تعلیم میں نہ چلے تو اسے دینی مدرسے میں داخل کرا دیا جاتا ہے کہ چلئے اسی بہانے وہ مفت میں پل بھی جائے گا اور کچھ پڑھ لکھ بھی جائے گا۔ ایسے طلبہ سے کس طرح توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ قوم کی دینی رہنمائی کا بھاری بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاسکیں گے۔ دوسری طرف دیکھئے کہ سی ایس پی افسر، ڈاکٹر یا انجینئر بننے کے لیے چونکہ پرکشش تنخواہیں اور سنہری مستقبل کا خواب ہوتا ہے لہٰذا قوم کی کریم اور اس کے ذہین ترین افراد اِن شعبوں کی طرف چلے جاتے ہیں اور دینی مدراس کے حصے میں محض تلچھٹ ہی آتی ہے۔اس صورتِ حال پر غور کرنے بلکہ اس سے نکلنے کی فکر اور پلاننگ ہونی چاہیے تاکہ ذہین بچوں کو دینی تعلیم کی طرف آنے کے لیے راغب کیا جاسکے۔

اس کے لیے ہمہ جہتی اقدامات کی ضرورت ہے جن میں سے بعض کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ مثلاً دینی مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ کے لیے روزگار کے مواقع وسیع کرنا، اچھے اساتذہ کا تقرر، دینی مدارس کے تعلیمی ماحول کو بہتر بنانا اور معاشرے کے کھاتے پیتے افراد کو ترغیب دلانا اور مطمئن کرنا کہ وہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے لیے فارغ کریں۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ بعض اوقات والدین مجبوری یا شوق و جذبات میں آ کر بچوں کو دینی تعلیم کی طرف دھکیل دیتے ہیں جب کہ بچے کا اپنا رُجحان اس کی طرف نہیں ہوتا۔ ایسے بچے کا، ظاہر ہے، دینی تعلیم کے لحاظ سے کوئی مستقبل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ والدین صرف ان بچوں کو دینی تعلیم کی طرف بھیجیں جن میں وہ ضروری رجحان دیکھیں اور اپنی مجبوریوں یا شوق سے بچے کو دینی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہ کریں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب بچہ سن شعور کو پہنچ جائے تو یہ حق اسے دیا جانا چاہئے کہ وہ مستقبل میں دینی تعلیم حاصل کرے گا یا نہیں؟ اس طرح جو بچے اپنی خوشی اور شوق سے دینی تعلیم کی طرف آئیں گے، وہی مستقبل میں کچھ کر کے دکھائیں گے اور جو مارے بندھے آئیں گے، وہ بہت کم سیکھ سکیں گے۔ دینی مدارس کو بھی چاہیے کہ وہ اس نقطہ نظر سے اپنے طلبہ کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیں اور جن طلبہ میں دینی تعلیم کا رجحان نہ دیکھیں، انہیں مدرسے سے فارغ کر دیں کیونکہ جو بچہ کسی مضمون میں شوق و دلچسپی نہ رکھتا ہو، وہ کچھ نہیں سیکھ سکتا۔

© rasailojaraid.com

تعلیمی پالیسی

کسی بھی تعلیمی ادارے کا ماحول طلبہ کی تعلیم وتربیت میں انتہائی اہم رول ادا کرتا ہے لیکن یہ ماحول کوئی مجرد چیز نہیں بلکہ یہ اساتذہ اورطلبہ کے باہمی تعامل سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس چیز کا مظہر ہوتا ہے کہ تعلیمی ادارہ چلانے والے تعلیم وتربیت کے کیا تصورات رکھتے ہیں اور وہ کس قسم کا طالب علم پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ سکول انتظامیہ اور اساتذہ جس قسم کا کلچر پروان چڑھانا چاہیں گے، اسی قسم کا ماحول تعلیمی ادارے میں پروان چڑھے گا۔ مثلاً اس وقت دینی مدارس میں ماحول پیدا کیا جاتا ہے کہ طلبہ جدید علوم نہ پڑھیں اورصرف اپنے مسلک کی حمایت سے متعلق مواد کا مطالعہ کریں۔ مدارس میں بالعموم کھیل کود کا انتظام نہیں ہوتا۔ بعض جگہ طلبہ کو چندہ جمع کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا اور بہت سے دیہات وقصبات میں ابھی تک طلبہ کا کھانا لوگوں کے گھروں سے آتا ہے یا وہ وہاں جا کر کھاتے ہیں۔ یا گھر گھر سے مانگ کر لاتے ہیں۔ ظاہر ہے ان سب باتوں سے دینی مدارس میں ایک خاص قسم کا کلچر پروان چڑھتا ہے۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ دینی مدارس کا موجودہ ماحول تبدیل ہونا چاہیے اور جو تجاویز ہم نے سطورِ بالا میں پیش کی ہیں، اگر ان پر عمل کیا جائے تو ان شاء اللہ ان تعلیمی اداروں کا ماحول خود بخود تبدیل ہو جائیگا۔

تعلیمی ادارے کے ماحول پر جو چیز اثر انداز ہوتی ہے، ان میں اساتذہ اور نصاب کے علاوہ غیر نصابی بلکہ ہم نصابی سرگرمیوں کا بھی بہت ہاتھ ہوتا ہے۔ ان سرگرمیوں کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں: ایک خالص دینی تربیت کی سرگرمیاں اور دوسری وہ سرگرمیاں جن میں طلبہ کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوتا ہے اوران کی شخصیت میں تعمیری رجحانات پروان چڑھتے ہیں۔ اوّل الذکر میں جھوٹ نہ بولنا، گالی نہ دینا، نماز باقاعدگی سے پڑھنا وغیرہ شامل ہے۔ جب کہ دوسری قسم کی سرگرمیوں میں تقریر وتحریر کی صلاحیت پروان چڑھانا، کھیلوں میں حصہ لینا، عملی سرگرمیوں میں شریک ہونا (جیسے تقریبات کا انتظام کرنے میں حصہ لینا، باغبانی کرنا، کلاس روم کی آرائش کرنا وغیرہ)......ضروری ہے کہ دینی مدارس میں ہم نصابی سرگرمیوں کو منظّم کیا جائے تاکہ طلبہ میں مذکورہ دونوں قسم کی صلاحیتیں پروان چڑھیں۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ بحیثیتِ مجموعی اس وقت دینی مدارس کا ماحول تبدیل کرنے کی سخت ضرورت ہے تاکہ طلبہ ایک نئے کلچر میں پروان چڑھ سکیں۔ اس نئے کلچر کے خدوخال کیا ہونے چاہئیں؟ اس پر نئے سرے سے کچھ لکھنے کی بجائے ہم یہ کہنے پر کفایت کریں گے کہ سطورِ بالا میں ہم نے دینی مدارس کے نظام میں جن تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے، اگر ان پر عمل درآمد کیا جائے تو موجودہ ماحول کی بندشیں خود بخود ڈھیلی ہونا شروع ہو جائیں گی اور ماحول میں کشادگی، وسعت اور رواداری کے دریچے وَا ہونا شروع ہو جائیں گے۔ **ان شاء اللہ**

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

مراجع وحواشی

۱۔ دیکھئے مثلاً تنظیم المدارس، پاکستان کا مجموعہ نصابِ تعلیم: پس منظر میں ص ۱۱ اور رابطة المدارس الإسلامية پاکستان کا مطبوعہ دستور اور نصابِ تعلیم: اغراض ومقاصد ص ۱،۲

۲۔ مولانا امین احسن اصلاحی، تزکیۂ نفس: ج ا ص ۱۷، طبع ملک سنز، فیصل آباد

۳۔ امام مالک، موطا، کتاب القرآن، دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۹۵۸ء

۴۔ ڈاکٹر محمد امین، تعلیمی ادارے اور کردار سازی، عزیز بک ڈپو، لاہور ۱۹۹۷ء

۵۔ نفس المرجع ص ۳۱، ۳۷

۶۔ نفس المرجع ص ۴۸، ۵۰

۷ جاحظ، البیان والتبیین ج ۲ ص ۹۲

۸۔ ابن حجر عسقلانی، تہذیب التہذیب: ج ۵ ص ۵۳

۹۔ مسلمانوں کے قدیم نظام ونصاب تعلیم کے لیے دیکھئے:

۱) ڈاکٹر احمد شلبی، تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور ۱۹۹۶ء

۲) محمد رشید رضا، تاریخ الاستاذ الامام شیخ محمد عبدہ، قاہرہ، طبع دوم ۱۳۴۴ھ

۳) ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کا قدیم نصابِ تعلیم در سہ ماہی 'المعارف' لاہور جولائی، ستمبر ۱۹۹۷ء

۱۰۔ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی بذیل علاء الدین خلجی

۱۱۔ بدایوانی منتخب التواریخ ج ا ص ۳۱۵ وبعد و محمد حسین آزاد، دربار اکبری ص ۶۷۳، ۶۷۴

۱۲۔ شبلی نعمانی، مقالاتِ شبلی ج ۳ ص ۱۲۴

۱۳۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، سوانح مولانا قاسم نانوتوی ج ۲ ص ۲۹۹ بحوالہ دیوبند کی سالانہ رپورٹ برائے سال ۱۸۷۰ء

۱۴۔ شبلی، مقالاتِ شبلی ج ۳

۱۵۔ ابوالکلام نے نہ صرف تذکرہ میں درسِ نظامی پر تنقید کی ہے بلکہ ۱۹۱۶ء میں جدید نصاب کی تدوین بھی کی (بحوالہ مولانا غلام رسول مہر در تبرکاتِ آزاد، اسی طرح انہوں نے ۱۹۴۶ء میں ایک کمیٹی بنائی، جس میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے جدید نصاب تیار کر بھی لیا جس کا ایک نسخہ رام پور لائبریری میں آج بھی محفوظ ہے، بحوالہ عابد رضا بیدار، ہندوستانی مسلمانوں کی ریفارم کے مسائل

۱۶۔ مولانا مناظر احسن گیلانی سوانح قاسمی ج ۲ ص ۲۹۳، ۲۹۴

۱۷۔ مولانا کے الفاظ یہ ہیں: ''علومِ دینیہ کی تعلیم کے لیے جو کتابیں اور جس ترتیب سے رکھی گئی ہیں وہ مقصد کے حصول کے لیے کافی نہیں ہیں، پھر ان کا جو طریق تعلیم ہے وہ بھی ناقص ہے۔''

۱۸۔ مولانا زین العابدین سجاد، ہندوستان کے عربی مدارس اور ان کے نصابِ تعلیم پر ایک نظر در مجلّہ ''اسلام اور عصر جدید'' دہلی جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۴۱

۱۹۔ اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ج ۱۲ ص ۹۸۴

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

۲۰۔ مجلّہ 'القاسم' دیوبند کا دار العلوم نمبر: محرم، ج ۷ ۱۳۴۷ھ ص ۴

۲۱۔ مولانا زین العابدین سجاد، ہندوستان کے عربی مدارس ...... درمجلّہ ''اسلام اور عصر جدید'' دہلی جنوری ۱۹۷۰ء ص ۴۴

۲۲۔ تفصیل کے لیے دیکھئے:

۱) مولانا محمد طیب، دار العلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی

۲) مولانا سید محمد میاں، علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے جلد اول

۳) مولانا مناظر احسن گیلانی، سوانح مولانا محمد قاسم نانوتوی

۴) ضیاء الحسن فاروقی، دیوبندی مکتبہ فکر اور مطالبہ پاکستان

۵) سید محبوب رضوی، تاریخ دار العلوم دیوبند

۶) ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، برساتی ہندوستان اور مدارس دار العلوم دیوبند،
درسہ ماہی المعارف شمارہ جنوری تا مارچ اور اپریل تا جون ۱۹۶۸ء

۲۳۔ پاکستان میں درس نظامی کے مالہ وماعلیہ کے لیے دیکھئے:

۱) ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، دینی مدارس کا نصابِ تعلیم اور جدید تقاضے المحمود اکیڈمی لاہور ۱۹۹۵ء

۲) سہ ماہی 'الشریعۃ' گوجرانوالہ کا خصوصی شمارہ، جولائی ۱۹۹۸ء

۲۴۔ ابن خلدون، مقدمہ، فصل فی ابطال الفلسفہ

۲۵۔ مجدد الف ثانی، مکتوبات، دفتر اوّل، مکتوب نمبر ۲۶۶ نیز دفتر سوم مکتوب ۲۳

۲۶۔ غزالی، احیاء علوم الدین، طبع قاہرہ ج ۳ ص ۲،۱۱

۲۷۔ غلام علی آزاد، مآثر الکرام، ص ۸۴، ۸۹

۲۸۔ ابن خلدون، مقدمہ طبع قاہرہ، ۱۳۸۲ء (باب ششم، فصل ۴۰) ج ۴ ص ۱۲۳۹

دینی مدارس کے دفاع اور ان کی اصلاح پر 'محدث' میں شائع ہونیوالے مضامین

اِدارہ محدث	اربابِ تعلیم اور اصحابِ مدارس کے لئے لمحہ فکریہ	جلد ۲ عدد ۲	۷ تا ۷
اِدارہ محدث	دینی مدارس کے خلاف زہر افشانی (فکر ہر کس بقدر ہمت اوست)	جلد ۲۰ عدد ۸	
اِدارہ محدث	وفاق المدارس السّلفیہ کے یکسانی نصاب کے متعلق تجاویز	جلد ۱۷ عدد ۱۰	
ثناء اللہ بلتستانی	مدینہ یونیورسٹی کی اعلیٰ مشاورتی کمیٹی کی سفارشات	جلد ۴ عدد ۹	۴۲ تا ۴۸
حسن مدنی، حافظ	حفظِ قرآن اور تجوید وقرات کا جدید تعلیمی منہج	جلد ۳۲ عدد ۵	۳۰ تا ۴۵
زاہد الراشدی، مولانا	دینی مدارس اور بنیاد پرستی	جلد ۳۴ عدد ۱	۴۴ تا ۵۶
صلاح الدین یوسف، حافظ	دینی مدارس مقاصد اور پس منظر	جلد ۲۶ عدد ۷	۲ تا ۹
صلاح الدین یوسف، حافظ	دینی مدارس، غلط فہمیوں اور شبہات کا ازالہ	جلد ۲۶ عدد ۹	۲ تا ۱۰
عبد الرشید اظہر	دینی مدارس کے نصاب اور طرزِ تعلیم پر ایک نظر (۳/اقساط)	جلد ۲ عدد ۶، ۷، ۸	کل: ۲۲
ممتاز احمد، ڈاکٹر	بنگلہ دیش میں دینی مدارس، نئے رجحانات	جلد ۳۲ عدد ۹	۷۵ تا ۷۸
یوسف لدھیانویؒ، محمد	فکر ہر کس بقدر ہمت اوست (دینی مدارس کے خلاف پروپیگنڈہ کا جواب)	جلد ۲۰ عدد ۸	۲ تا ۷

www.KitaboSunnat.com